© rasailojaraid.com

تعارفِ کتب

پاکستان کے معاشی مسائل (بزبانِ انگریزی) | تالیف: سید عنایت حسین صاحب۔ ایم اے (معاشیات)، (آنرز، گولڈ میڈل)

اس کتاب کے فاضل مصنّف علمِ معیشت سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ آلو کی فصل کے متعلق ان کے مختلف مضامین جو بعض اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں اُن کے مطالعہ سے اُن کی ذہانت اور تبحرِ علمی کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی اور صرف معاشیات کے طلبا تک محدود رہی۔ گذشتہ سال صدر محترم کی گراں قدر رائے نے اس فاضلانہ تصنیف کو ملک کے اندر اور باہر ایک نہایت اونچا مقام عطا فرمایا ہے۔ اس تصنیف میں مقدمہ کے علاوہ ۲۳ ابواب ہیں، جن میں پاکستان کے معاشی مسائل پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے۔

پاکستان کی معیشت کے بارے میں اُردو اور انگریزی میں کئی ایک کتابیں موجود ہیں لیکن اس کتاب کو ان سب پر اس وجہ سے امتیاز حاصل ہے کہ اس میں پاکستان کے فکری پس منظر سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ہماری معاشی ترقی کی راہ میں ہمارے بعض اساسی افکار و تصوّرات حائل ہیں۔ اس لیے جب تک ان کے اندر کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں کی جاتی اہلِ پاکستان کی خوشحالی حکایتِ تشنہ و سراب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

کتاب کے فاضل مصنّف بالکل آغاز ہی میں ہماری قومی زندگی میں معاشیات کی اہمیت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں تو اس سے بھی تجاوز کر کے یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ اسلام کے احیا کے لیے کوئی تحریک بھی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ مسلمانوں کی معاشی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقطۂ نظر سے تعمیر نو نہ کی جائے۔ اس کے بغیر نہ تو اُن کے ایمان میں ثبات پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی اُن کے اعمال کو غیر متزلزل بنیادیں فراہم ہو سکتی ہیں۔" (صفحہ ۱۱۱)

اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جس تدبیر کی نشاندہی کرتے ہیں وہ یہ ہے:

"معاشی مسائل کو صرف معاشی قوانین کی مدد سے ہی حل کیا جائے کیونکہ مذہب سے ان کا انسلاک دونوں کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتا ہے"

ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑتے کہ جناب عنایت حسین صاحب کا یہ قول کہاں تک درست ہے اور بڑے بڑے معیشت دان مثلاً مارشل، پیگو اور لارڈ کینیز اس نظریہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں خود اُن کی اپنی تصریحات ہی نقل کرتے ہیں۔

کتاب کے صفحہ چالیس پر اسلام اور معیشت کے عنوان کے تحت وہ رقمطراز ہیں:

"دنیا کے بیشتر مذاہب کے برعکس اسلام اپنے ماننے والوں کو زندگی کے روزمرہ کاروبار میں جس میں معاشی اور معاشرتی سرگرمیاں بھی شامل ہیں، شرکت کی پوری پوری آزادی عطا کرتا ہے۔ انہیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ وہ اخلاقی حدود وغیرہ کے اندر رہ کر اپنی فطری احتیاجات کو پورا کریں۔"

فکر و نظر کا یہ تضاد ایسا ہے جسے ہم دُور کرنے کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتے۔ اس تضاد کی سب سے بڑی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ فاضل مصنف قوانینِ شرعی اور قوانینِ طبیعی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ تمام سائنٹفک قوانین جن کے تحت قدرت کا یہ کارخانہ ایک سگے بندھے ضابطے کے تحت چل رہا ہے وہ سارے کے سارے اسلامی ضوابط ہی ہیں اور صرف ان کی پیروی ہی سے اسلام کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ تصور اتنا غلط اور لغو ہے کہ اس سے دین کی پوری عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ اگر اسلام صرف قوانینِ طبیعی کی پیروی کا ہی دوسرا نام ہے تو پھر دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور کتبِ سماوی کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ انسانی ہدایت کے لیے اس نظریہ کی رو سے سائنس دان اور اُن کے انکشافات ہی کافی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ چیز تو اسلام کی عین ضد ہے۔ دنیا میں جتنے انبیاء تشریف لائے ہیں انہوں نے نوعِ انسانی کو یہ بتایا ہے کہ قوانینِ طبیعی سے جو قوت و طاقت اسے حاصل ہوتی ہے اسے کس طرح قوانینِ شرعی کے اندر رہ کر استعمال کیا جائے۔

دورِ جدید میں جو زبردست انتشار نظر آ رہا ہے وہ صرف قوانینِ طبیعی کی بے قید پیروی کی وجہ سے ہی ہے۔ اور ایک مغربی مفکر کے بقول "اہلِ مغرب کو سائنس نے وہ قوت طاقت بخشی ہے جو دیوتاؤں کے شایانِ شان ہے مگر وہ اس سے سکول کے ناتراشیدہ بچوں کی طرح فائدہ اٹھا رہے ہیں"۔

ہمیں فاضل مصنف کا یہ نظریہ بھی کچھ عجیب و غریب سا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں کے لوگوں میں یاس و قنوطیت کے جو جذبات بڑی سرعت کے ساتھ پرورش پا رہے ہیں ان کا سبب معاشی ترقی کی سست رفتاری ہے۔ اس ملک میں معاشی استحکام کے لیے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ کچھ زیادہ تشویشناک نہیں۔ یہاں اصل تکلیف دہ صورت جس نے لوگوں کو سخت مایوس کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے معاملے میں اس قوم کے ساتھ جو وعدے کیے گئے تھے انہیں پورا نہیں کیا گیا۔ اور یہی ہمارے نزدیک اس قوم کی بددلی کا حقیقی سبب ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب کے چوتھے باب میں جن افکار و نظریات کا اظہار کیا ہے اور جو درحقیقت اُن کے نزدیک اس کتاب کی جان ہیں، اُن میں سے بھی اکثر و بیشتر سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

انہوں نے اپنی بحث اس غلط مفروضے پر اٹھائی ہے کہ مذاہب طبیعی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ ہندوستان کے طبیعی حالات پیش کرتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ اس نیم براعظم کی شادابی نے لوگوں کو مختلف آستانوں پر جھکنے کے لیے آمادہ کیا۔ یہ تصور بڑا ہی غلط اور گمراہ کن ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں پہاڑوں، دریاؤں اور سبزہ زاروں کی کثرت نے بت پرستی کو جنم دیا ہے تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا چاہیے کہ عرب میں ان چیزوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضروریات کا بھی لحاظ کیا ہے، جن میں سے ایک بڑی اہم ضرورت علاجِ امراض ہے۔ اس علاج کی خاطر ناگزیر ہے کہ طبیبوں اور طبیبات، دونوں ہی کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ مردوں اور عورتوں دونوں کا علاج کرنے کے قابل ہو سکیں، کیونکہ انسان کو ایسے حالات پیش آ سکتے ہیں جن میں ایک عورت کا علاج کسی مرد طبیب کو، اور ایک مرد کا علاج کسی عورت طبیبہ کو کرنا پڑ جاتا ہے اور یہ لازم نہیں ہے کہ ہمیشہ ہر حال میں مردوں کو مرد ہی طبیب اور عورتوں کو عورت ہی طبیبہ مل سکے۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہے کہ اس حرمت کو بضرورت مباح کیا جاتے۔ البتہ اس طرح کی تمام اباحتوں میں یہ قاعدۂ شرعیہ ملحوظ رہنا ضروری ہے کہ ان سے صرف بوقت ضرورت اور تا بحد ضرورت کام لیا جائے اور انہیں مطلقاً مباح سمجھ کر حرمت کی ساری حدیں نہ توڑ دی جائیں۔

یہ تو ہے تعلیم طب کے معاملہ میں آپ کے سوال کا جواب۔ رہا ہسپتالوں کا معاملہ، تو شرعی نقطۂ نظر سے مخلوط ہسپتال بالکل غلط ہیں۔ مردوں کے لیے الگ ہسپتال ہونے چاہییں جن میں ڈاکٹر، نرس، ڈسپنسر وغیرہ سب مرد ہوں۔ اور عورتوں کے لیے زنانہ ہسپتال ہونے چاہییں جن میں عورتیں ہی ڈاکٹر، نرس اور ڈسپنسر ہوں۔ عورتوں کا علاج مردوں سے، یا مردوں کا علاج عورتوں سے کرانا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ علاج کی خاطر ستر کھولنا ناگزیر ہو، صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ اس کے سوا چارہ نہ ہو۔ اسے عام قاعدہ کسی حال میں نہیں بنا لینا چاہیے۔

تعلیم کے معاملے میں بھی مخلوط میڈیکل کالج قابلِ اعتراض ہیں۔ زنانہ میڈیکل کالج قائم کرنا جب ممکن ہے اور اس کے لیے اسباب فراہم ہو سکتے ہیں تو آخر کیوں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ طبی تعلیم دی جائے؟ طبی تعلیم کی نوعیت جیسی کچھ ہے اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ساتھ پڑھنا تو دونوں میں حیا کی رمق بھی باقی نہیں چھوڑتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے بوسیدہ افکار و نظریات اُن کی گردنوں میں طوق بن کر لٹکے ہوئے ہیں اور وہ انہیں نئے اور ترقی یافتہ طریقوں کے اختیار کرنے سے ہمیشہ باز رکھتے ہیں ۔ مذہب کے اصل سرچشموں سے اُن کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے ۔ لیکن انہوں نے دوسری اقوام کی طرح اس بات کی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی کو قومیت کی بنیاد پر پھر سے تعمیر کریں ۔ (ص ۴۲)

چند صفحات کے بعد بلی پوری طرح تھیلے سے باہر آجاتی ہے اور وہ بڑے واشگاف الفاظ میں فرماتے ہیں :۔

"اس بیماری کا علاج یہی ہے کہ امورِ دنیا کو دین سے یکسر الگ کر دیا جائے اور اُس پالیسی کو واضح طور پر اپنا لیا جائے جسے اتاترک نے ترکی میں اختیار کیا تھا"

جناب عنایت حسین صاحب کی اس پوری بحث کا مرکز و محور یہی نقطہ ہے اور اسی پر انہوں نے قوم کی توجہ منعطف کرانے کی پوری کوشش کی ہے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں جو متجددین عام طور پر استعمال کرتے ہیں ، یعنی اسلام کی جدید تعبیر پر زور ، ملا کو گالیاں دینا ، سرسید اور اتاترک کی بے پناہ تعریف و توصیف اور علامہ اقبال کے کلام سے ناجائز استفادہ ۔

تبصرہ نگار نے علامہ اقبال مرحوم کی قریب قریب ساری تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے لیکن اسے بڑی تلاش و جستجو کے باوجود کہیں یہ نظر نہیں آیا کہ علامہ صاحب نے دین و سیاست کی جدائی کی تلقین کی ہو ۔ انہوں نے تو ہمیشہ اسی بات پر زور دیا ہے : ع

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہم نے اس بات کا کھوج لگانے کی بھی پوری کوشش کی ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کونسے ایسے علماء تھے جنہوں نے امتِ مُسلمہ کو مغربی فلسفہ و تاریخ اور مغربی ایجادات و انکشافات سے بے بہرہ رکھنے کی احمقانہ سعی کی ۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں اس معاملے میں سخت ناکامی ہے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علمائے ربانی نے جس چیز کی مخالفت کی تھی، وہ مغربی علوم و فنون کا اکتساب نہ تھا بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کی نقالی تھی اور یہ چیز آج بھی قوم کے لیے اتنی ہی مہلک ہے جتنی کہ آج سے سو برس پہلے تھی۔ مغربی تہذیب کے پرستار اس کی مدح میں جو چاہیں کہتے رہیں لیکن حالات نے علماء (اللہ تعالیٰ انہیں کروڑ کروڑ جنت عطا فرمائے) کے اس موقف کو بالکل صحیح اور درست ثابت کیا ہے۔ یہ اسی مغربی تہذیب کی ذہنی غلامی کا نتیجہ ہے کہ کچھ لوگ یہاں بڑی بیباکی کے ساتھ مسلمانوں کو اپنا مقصدِ حیات تک تبدیل کر دینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

فاضل مصنف نے حکومت پاکستان کو ایک "سٹیٹ چرچ" کے قیام کا بھی مشورہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

> "یہ وہ مناسب وقت ہے جب ہمیں ایک ایسا بورڈ قائم کرنا چاہیے جس میں آزاد اور جدید تصورات رکھنے والے علما کو شامل کیا جائے تاکہ وہ مولانا جلال الدین رومی، علامہ اقبال اور اتاترک کے نظریات کے مطابق اسلامی افکار کی تشکیلِ جدید کریں۔"

مولانا جلال الدین رومی اور علامہ اقبال کے نام تو محض اس مشن کو مقدس بنانے کی غرض سے شامل کیے گئے ہیں، ہدایت کا اصل منبع تو صرف اتاترک ہے۔ ہمیں ان تینوں کے افکار و نظریات کے درمیان کوئی قدرِ مشترک ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ ایک "الجھا ہوا" ذہن ہی ان تینوں کو جمع کر سکتا ہے۔

آخر میں ایک آدھ مثال مصنف کے طرزِ استدلال کی بھی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ ایک مقام پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سیاسی قوت معاشی قوت ہی سے پیدا ہوتی ہے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ عربی کی مشہور ضرب المثل الناس علیٰ دین ملوکہم پیش فرماتے ہیں۔

کتاب کو دینِ محمدی پریس نے عمدہ طباعتی معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔

© rasailojaraid.com